عاقب شہزاد قریشی

لیکچرر اُردو

گورنمنٹ گرلز انٹر کالج، باغ آزاد کشمیر

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

محمد عاصم بٹ کا فکشن: فلسفۂ وجودیت

Muhammad Asim Butt is a well-known fiction and storywriter. One of features of his writing is that it contains elements of existentialism. His four publications Ishtihaar Aadami, Dastak, Daira, Naatamaam were analyzed from existentialism perspective. His writing clearly depicts different elements of existentialism as death, anxiety, authenticity and social criticism. He further elaborated the effects of psychological factors on human life and highlighted importance of brining social cohesion. Further, his writings are influenced by German novelist, Frank Kafka.

آج ہم جس دَور میں زندہ ہیں، وہ بعض حوالوں سے منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ موجودہ صدی میں سائنس کی تیز رفتار ترقی نے انسان کی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ تہذیبی حوالے سے آج کی دُنیا اتھل پتھل کا شکار ہے۔ انسان اور کائنات کے بارے میں پرانے تصورات شکستہ واہموں کا روپ دھار چکے ہیں اور انسانی عظمت کے خواب پریشاں ہو چکے ہیں، ایسے میں نئے لکھنے والے بے یقینی کی صورت حال کا شکار ہیں۔

آج کے لکھنے والوں کے ہاں جو سب سے بڑی کمی محسوس کی جاتی ہے وہ حیات و کائنات کے بارے میں بڑے سوالوں کا نہ ہونا ہے۔ عظیم تخلیقی فن پاروں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ بڑے فکری سوالات ہی بڑی تخلیقات کو جنم دیتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے ایسے دور میں آنکھ کھولی ہے جسے ”معلومات کے عہد“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے ارد گرد معلومات کے انبار لگے ہیں میڈیا ہر زور سینکڑوں خبریں ہمارے کانوں میں انڈیلتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک آرام دہ زندگی کے لیے کافی ہے۔ ایسے میں سنجیدہ اور گہرے فکری سوالات کے لیے جگہ ہی

کہاں بچتی ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی کوئی سنجیدہ اور فکری سوالات پر غور کرنے والا ذہن سامنے آتا ہے تو ہم اُسے خوش گوار حیرت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔

عاصم بٹ کا شمار ایسے ہی اذہاں میں ہوتا ہے جو آسان راہوں پر چلنے کے برعکس مشکل راہوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ عاصم بٹ نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں نہ صرف سامنے کے مظاہر کو اپنا موضوع بنایا ہے بلکہ ماورائے حواس دنیا کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ محمد عاصم بٹ کو معمولی باتیں، عام لوگ اور غیر اہم واقعات متاثر نہیں کرتے بلکہ اُنھیں ایسی چیزوں سے رغبت ہے جن میں کوئی نئی جہت نظر آئے۔ وہ اپنی ذات میں گم رہنے والے تخلیق کار ہیں، جو خارجی حالات سے کم اور باطنی تلاطم سے زیادہ متاثر ہیں۔

عاصم بٹ ایک فلسفیانہ ذہن رکھنے اور اسے زندگی میں برتنے والے انسان ہیں۔ اُن کے فکشن میں وجودیت بالخصوص کافکا کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ کافکا ایک بیمار، لاغر، مردم بے زار، افسردہ، قنوطیت پسند اور تلخ انسان تھا۔ جس کے ہاں احساسِ عدم تکمیلیت و بیگانگیت کا رجحان پایا جاتا ہے، جس کا اثر عاصم بٹ کی مجموعی فکشن نگاری پر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ارشد معراج نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ ''ماہیتِ قلبی کی اضطراری کیفیت، لایعنیت، اضطراب اور کرداروں کے ذریعے کہانی کا بیان، جیسے وجودی اثرات عاصم بٹ کو کافکا کے قریب کرتے ہیں۔''

عاصم بٹ کے ہاں انسانی بیگانگیت اور لایعنیت کو بنیادی مرکز بنایا گیا ہے۔ ماہیتِ قلبی کافکا کا خاص مسئلہ ہے اور یہی کیفیت عاصم بٹ کے ہاں ملتی ہے۔ عاصم بٹ کے کرداروں میں اضطراری کیفیت جاری و ساری رہتی ہے۔ عاصم بٹ زندگی کے تحرک کو جاری رکھنے کے لیے ایک قالب سے دوسرے قالب اور دوسرے سے تیسرے قالب میں جست بھرتا ہے۔ اس کے باوجود عدم تکمیلیت موجود رہتی ہے۔ یہی عدم تکمیلیت کا احساس اضطراب پیدا کرتا ہے جو وجودیت کا بنیادی عنصر ہے۔

ذات کی شناخت اور عدم تکمیلیت عاصم بٹ کی کہانیوں میں بنیادی مسئلے کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ کہانیوں کے کردار عدم تکمیلیت سے تکمیلیت کی جانب اس طرح راغب ہوتے ہیں کہ بعض اوقات وہ اپنی اصل بھول کر کردار کو ایسے اوڑھتے ہیں کہ وجود جوہر پر مقدم ہو جاتا ہے۔

اندرون شہر کی معاشرت اور نچلے متوسط طبقے کے کرداروں کے معاشی، ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی جھمیلوں کی سچائی پر مبنی پیشکش عاصم بٹ کا خاصہ اور ان کے فن کی پہچان ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کو علامتی اور تمثیلی عناصر

سے گہری معنویت بخشی ہے۔ مثال کے طور پر ’’ عہد گزشتہ کی ایک کہانی‘‘ میں وقت میں الٹی جست کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کو حال میں پیش کیا گیا ہے۔ جو واقعات افسانہ نگار نے بیان کیے ہیں، وہ کتنے صحیح یا غلط ہیں، اِس سے بحث نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ہمیں ایک ایسے زمانے کی بشارت دینا چاہتا ہے، جب سورج کے روپوش ہونے کے بعد دنیا کے باشندے بے خوابی کے مرض کا شکار تھے اور جن کے گھروں میں موت نے چوہوں کی شکل میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ یہاں ہمیں ’’سورج کی روپوشی اور چوہوں کی شکل میں موت‘‘ کی علامتی جیت پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر اس افسانے کے لیے ’’ عہد گزشتہ کی ایک کہانی‘‘ کے عنوان کا انتخاب بھی معنویت کا حامل ہے کہ اس سے افسانے میں ماضی کی جیت کا اضافہ ہو جاتا ہے اور افسانہ بیک وقت تینوں زمانوں پر محیط دکھائی دیتا ہے۔ اس کہانی کا بنیادی مسئلہ تنہائی اور اجنبیت ہے۔ لوگوں کے اجتماعی رویے بیگانگی کا شکار ہیں اور وہ خود غرضی کا شکار ہو چکے ہیں۔

عاصم بٹ پر کافکا کے فکری اور اسلوبیاتی اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں کہ اس کے ہاں بھی ایک ایسی سیال کی کیفیت ملتی ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن بیان کی گرفت میں لانا مشکل ہوتا ہے۔ عاصم بٹ نے کافکا کے تراجم کا دیباچہ تحریر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اُس نے ایک برس کافکا کی دنیا میں گزارا ہے اور یہ ایک ایسا تجربہ تھا، جو مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔

عاصم بٹ کے ہاں ہماری زندگی کے اُن پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لینے کی سعی نظر آتی ہے جو حواس اور عقل کے دائرے میں نہیں آتے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کہانی کے بیان کے لیے ایسے اسلوب کا انتخاب کرتے ہیں کہ جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے، باتیں غیر معمولی اور شکلیں دھندلی ہوتی چلی جاتی ہیں۔

عاصم بٹ کے پہلے افسانوی مجموعے پر ہمیں موت کا منظر چھایا ہوا ملتا ہے۔ ان افسانوں میں صرف یہی نہیں کہ بار بار کردار موت سے دوچار ہوتے ہیں بلکہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں انسانوں کے کردار مردنی کا شکار ہیں جبکہ بے جان اشیاء اور اشتہارات میں کچھ کچھ جان نظر آتی ہے۔ امجد طفیل لکھتے ہیں:

> ایسا نہیں کہ عاصم بٹ نے ’کافکا‘ کی نقالی کی ہے بلکہ مجھے تو کافکا اور عاصم بٹ کی شخصیتوں میں گہری مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ زندگی سے بیزاری اور موت سے غیر معمولی شغف ان کو ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے۔ ۱

" تیز بارش میں ہونے والا ایک واقعہ" عاصم بٹ کے فکری رویے کی تفہیم میں بنیادی کلید کا حامل ہے کیونکہ اس میں افسانہ نگار کی دلچسپی کے بہت سے عناصر یکجا ہو گئے ہیں۔ اس افسانے میں عاصم بٹ نے وقت کے ساتھ قدرے مختلف برتاؤ کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے افسانے میں خواب ناکی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ افسانہ عاصم بٹ کی وجودی فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسے فرد کی کہانی ہے جو وقت سے آگے نکل جاتا ہے اور آنے والے واقعات کا ادراک حاصل کر لیتا ہے مگر وہ ان واقعات یا ان کی ترتیب کو بدلنے پر قادر نہیں ہوتا۔ یوں اس کا المیہ جنم لیتا ہے۔ کہانی کا آغاز عام شخص کی کہانی کے طور پہ ہوتا ہے لیکن کچھ ہی دیر میں افسانہ پڑھنے والا کسی سنسنی خیز دنیا کی سیر کرنے لگتا ہے۔ اس افسانہ میں تجسس اور حیرت کی واردات کار فرما ہے۔ کسی فرد کے لاشعور میں چھپے خوف کی داستان بیان کی گئی ہے اور یہی خوف عاصم بٹ کی وجودی فکر کا اظہار کر رہا ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار 'حمید ناصر' بظاہر زندگی سے معمور شخص نہیں لگتا۔ زندگی سے اکتاہٹ اور بیزاری اس کے کردار میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ وہ گھر سے نکلتے ہوئی بہت ساری باتیں سوچ کر نکلتا ہے لیکن راستے میں پیش آنے والے واقعات اس پر گہرا اثر مرتب کرتے ہیں۔ وہ بعض اوقات جو بات نہیں سوچتا وہ بات ہو جاتی ہے اور زندگی کا سارا پانسہ ہی پلٹ جاتا ہے۔ یہی المیہ ہر اس انسان کا ہے جس کی زندگی ماضی، حال اور مستقبل سے جڑی ہوئی ہے۔ تاہم وہ وقت کے ہاتھوں بے بس ہے۔ طے شدہ عمل کو ایک ذرہ بھر بھی اِدھر اُدھر سرکانا کسی کے بس میں نہیں۔ جبریت کا یہ عالم کہانی کے زندہ مناظر میں ایک عجیب و غریب وحشت بھر دیتا ہے۔ لیکن مجموعی سطح پر جو المیہ جنم لیتا دکھائی دیتا ہے، وہ افسانہ ختم ہونے پر لفظ لفظ میں تھکن اتارتا محسوس ہوتا ہے۔

"اشتہار آدمی" ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس کے لیے زندگی، زندگی کی بجائے اشتہار میں زیادہ خوب صورت دکھائی دیتی ہے۔ وہ اشتہارات کی دنیا میں زندہ ہے۔ ایک کے بعد ایک اشتہار اس کی زندگی میں اس طرح شامل ہو جاتا ہے کہ وہ تصورات کی دنیا کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے۔ وہ شہری زندگی سے محروم ہے اور اشتہارات اس کی ان محرومیوں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ یوں وہ خیالی دنیا میں جا کر اپنی ناآسودہ خواہشات کی تسکین کرتا رہتا ہے۔

زندگی کی لغویت بھرپور انداز میں افسانے کے کردار سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنی حقیقی زندگی سے مسلسل رشتہ توڑتا چلا جاتا ہے اور خود کو اشتہار میں موجود حسیناؤں کے سپرد کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے لیے اشتہاروں میں موجود زندگی زیادہ متحرک ہو جاتی ہے۔ بقول سلیم الرحمن:

> اشتہار آدمی ایک شخص کے کردار کی نفسیات کی کہانی ہے۔ وہ خود کو اپنی پیدا کردہ سحر انگیز تخیلاتی دنیا میں گم کر دیتا ہے جو ان ماڈل لڑکیوں کی وجہ سے ہے جن پر وہ فریفتہ ہو چکا ہے۔ یقین سے یہ کہنا بھی ناممکن ہے کہ ایسی زندگی جس میں وہ اشتہار کے ذریعے تسکین حاصل کرتا ہے، اس زندگی سے بہتر ہے جو خارج میں موجود اپنی بدصورتی اور انتشار میں حقیقی ہے۔ ۲

یہ کہانی دراصل وجودی اور نفسیاتی مسائل پر مبنی ہے۔ جب لوگوں کی زندگی میں محرومیاں بڑھ جاتی ہیں تو وہ فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ افسانہ نگار نے بڑے بے رحم انداز میں ایسے لوگوں کی کیفیات کی عکاسی کی ہے۔ بقول منشا یاد:

> اشتہار آدمی جنسی گھٹن اور نفسیاتی الجھنوں کی کہانی ہے۔ ایک شخص جس کی زندگی میں خوابوں اور تصورات کے سوا کچھ نہیں، وہ ٹی وی اور ریڈیو پر آنے والے اشتہارات کی لڑکیوں سے محبت کرتا اور انھی کے تصور و خواب سے اپنی جنسی اشتہا پوری کرتا ہے۔ ۳

''اشتہار آدمی'' نے جدید عہد کی حسّیت، ژولیدگی، اسراریت اور دھندلکوں سے جنم لیا ہے۔ یہ عہد اشتہار کا عہد ہے، جہاں اشیا ہی نہیں خیالات و افکار بھی ہم تک اشتہار کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ ہمارے طرزِ حیات پر غیر محسوس انداز میں اس کی چھاپ لگ گئی ہے اور ہم غیر علانیہ طور پر اشتہارات کے غلام بن چکے ہیں۔ ہماری پسند ناپسند، یہاں تک کہ ہمارے جذبے بھی ان کے تابع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کہتے ہیں:

> اشتہار آدمی ایک الم ناک مضحکہ خیزی سے جنم لیتی کہانی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار اشتہار بازی کا ایسا اسیر ہوتا ہے کہ اس کے خواب اور آئیڈیل بھی اسی فضا کے اثر میں آجاتے ہیں، بظاہر یہ آج کے آدمی کا ایک بڑا المیہ ہے۔ ۴

یہ کہانی دراصل ایک شخص کی کہانی نہیں بلکہ ایک ایسے ماحول کی کہانی ہے جسے جدید عہد نے ترتیب دیا ہے۔ کردار بے معنی ہیں، اصل چیز رویے اور زندگی کو دیکھنے اور برتنے کے انداز ہیں جو اشتہاری دنیا سے پیدا ہوتے ہیں افسانے کا ہیرو زندگی کی لغویت اور یکسانیت جیسے وجودی مسائل کا شکار ہے۔ اس کا بنیادی مسئلہ اس کی اقتصادی حالت ہے۔ اس کے پاس خواب تو ہیں لیکن ان کی حقیقت نہیں ہے۔ اس میں پورے ماحول کا دکھ بھی جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دوستوں کے رویے سے پیدا ہونے والی مایوسی، دفتر کا گھٹن زدہ ماحول، گھر کی سیلن زدہ کس مپرسی، سیاسی و سماجی مسائل میں موجود اکتاہٹ اور کراہت اور ٹی ہاؤسز میں ہونے والی بے معنی اور لغو گفتگو۔۔۔ یہ سب وجودی

کیفیات مل کر اس کہانی کے ماحول کو تخلیق کرتے ہیں۔اشتہار آدمی انسانی خواہشوں، تمناؤں اور ارادوں کی عدم تکمیلیت کانوحہ ہے۔

''گڑھے کھودنے والا'' یہ کہانی روزمرہ کے ایک جیسے مشینی انداز میں انجام دیئے جانے والے دفتری کاموں پر ایک گہرا طنز موجود ہے۔دوسرے افسانوں کی طرح یہ بھی معاشرتی جبر اور زندگی کی یکسانیت سے اکتائے ہوئے بیزار آدمی کی کہانی ہے۔

کہانی کا مرکزی کردار زندگی کے معمولات سے پیدا شدہ بیزاری اور یکسانیت سے اکتاہٹ کا شکار ہے اور یہی اکتاہٹ اپنی حدوں سے گزر کر اسے بے معنویت کا احساس دلاتی ہے اور اسے لگتا ہے کہ وہ دن میں کئی بار اپنی قبر کھودتا ہے اور ہموار کرتا ہے۔عاصم بٹ نے اس افسانے میں جدید زندگی کی پیچیدہ سے پیچیدہ تر وضعوں کا انسانی کرداروں پر پڑنے والے وجودیاتی اثرات کا فنی وجمالیاتی اظہار کیا ہے۔ڈاکٹر نوازش علی لکھتے ہیں:

> انسانی کردار میں بہت سی الجھنیں پڑچکی ہیں۔فکر وشعور بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔اپنے عہد کے وجودیاتی مسائل میں گرفتار گڑھے کھودنے اور انہیں پُر کرنے والے اور چاروں طرف سے امڈتے ہوئے آشوب میں گھرے ہوئے اور پُر شور ڈراؤنے خوابوں سے جاگ اٹھنے والے اور نفسیاتی دباؤ تلے سسکتے ہوئے افراد ان کہانیوں کے بنیادی کردار بنتے ہیں۔۵

عاصم بٹ کی یہ کہانی ''فرد'' کے مسئلے کو سامنے لاتی ہے۔فرد مجموعہ میں اکائی کی صورت رہ رہا ہے لیکن مجموعے کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس کا حصہ نہیں ہے۔اسے جو زندگی ملی ہے وہ اس کا اپنا آزادانہ اختیار نہیں ہے۔سماجی ڈھانچہ بُری طرح بکھر چکا ہے۔جدید اور بڑے شہروں کی زندگی تنہائی کے آشوب کو پیدا کر رہی ہے۔''فرد'' کو والیم فائیو کی گولیوں پر گزارا کرنا پڑ رہا ہے لیکن پُر سکون نیند پھر بھی میسر نہیں۔ڈراؤنے خواب اور ذہنی کرب ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔''فرد'' پستول کی گولیاں سر میں اتار کر اپنا مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ ویلیم فائیو کے مقابلے میں پستول کی گولی والا نسخہ کہیں زیادہ پُر تاثیر ہے۔

معاشی جبر اور فرد کی بے بسی کہانی کے مرکزی کردار کے لیے ایسا المیہ ہے جو اس کو اول اول نیند کی گولیاں اور بعد میں پستول کی گولیاں اپنے اندر اتارنے پر مجبور کر دیتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ کردار مرتا نہیں اور کہانی کا تسلسل باقی رہتا ہے۔بحیثیت مجموعی یہ افسانہ گہرا المیاتی تاثر لیے ہوئے ہے۔انسان کی بے بسی کا اندازہ اس پیرائے سے ہوتا ہے۔

> رات کو چار گولیوں کی خوراک پانی کے ساتھ نگل لینے کے باوجود آدھی رات کو نہایت بے کلی کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔اس بار سر کا درد فنروں تر رہے۔وہ اس کی ٹیس اپنے دل اور پیروں کے ناخن تک محسوس کر رہا تھا۔۔۔اس نے دراز کھول کر ریوالور اٹھالیا۔اسے ہاتھ میں تولتے ہوئے اسے بالکل یاد نہیں آیا کہ اس میں کوئی گولی موجود ہے یا نہیں۔۔۔بس ریوالور کی نال کو ماتھے پر درمیان میں رکھا اور ٹریگر دبادیا۔۶

افسانے میں فرد کی بے بسی کے ساتھ ساتھ اس کی بے برکت محنت اور بے ثمر مشقت کرنے والوں کا اندوہ ناک قصہ بیان ہوا ہے کہ جن کی مہارتیں اور جملہ صلاحیتیں زندگی کے ارتقا میں صرف ہونے کی بجائے اپنے اپنے حصے کا گڑھا کھودنے اور پھر اسے بھرنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔ گویا اس افسانے میں جدید عہد کے وجودی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

''شکاری''عاصم بٹ کا علامتی افسانہ ہے۔عاصم بٹ نے اس افسانے کی مدد سے ہمارے ایک اور معاشرتی رویے کو بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس نئے عہد میں، جب زندگی کی تیز رفتاری زیادہ ہو گئی ہے، ہماری ایک خاص کلاس جو بے عمل رہ کر زندگی کی آسائشوں سے لطف اٹھانا چاہتی ہے۔افسانے کا ہیرو جب اپنی زندگی میں متحرک تھا تو کچھ نہ کر پایا لیکن اب ریٹائر ہونے کے بعد اسے اس کی خواہش نے ایک بار پھر سے زندہ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان یا فرد تخلیق کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے اور وہ حالات اس میں عموماً دو طرح کے رجحانات پیدا کرتے ہیں۔ایک تبدیلی اور دوسرے فرار کی کیفیات............... ''شکاری'' کا ہیرو نچلے طبقے کے فرد کی طرح کچھ نہ کر سکنے کا احساس لیے تخیلاتی دنیا میں رنگ برنگی تتلیوں اور کبھی نہ مرنے والی مچھلیوں کی دنیا میں بس جاتا ہے۔اور اگر عزمِ سفر کرتا بھی ہے تو اس تخیلاتی دنیا کا، جو کہ بظاہر ناممکن ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کے بقول:

> عاصم بٹ اس نسل کا نمائندہ ہے چناں چہ جب وہ اپنے آس پاس پر غور کرتا ہے تو اس کے نتائج اور رویے پرانے فکری رویوں اور نتائج سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہونا بھی چاہیے اس نے اپنی مختلف رویوں پر اپنی کہانیوں کی عمارت استوار کی ہے اور یہی ان کہانیوں کی جدت اور انفرادیت ہے۔۷

''آخری فیصلہ'' غریب طبقے کے اس فرد کی کہانی ہے جو اپنے ساتھ خواہشات لے کر پیدا ہوتا ہے اور اپنی تمناؤں کے ہاتھوں خودکشی کر لیتا ہے۔اسے اس کی اوقات کے مطابق سب کچھ میسر تو ہے لیکن اس کے باوجود اسے

اپنی زندگی بے معنی لگتی ہے۔ کیونکہ زندگی میں اس کی مرضی کو دخل نہیں ہے۔ یہ بات انسانوں کے لیے بہت ہتک آمیز ہے کہ ان کو پیدا بھی کر دیا جائے اور مرضی بھی چھین لی جائے۔

> خواب تو ہر شخص دیکھتا ہے۔ اچھے بھی اور برے بھی۔ ایک خواب دیکھا ہے اپنی موت کا۔ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں اپنی موت پر قادر ہوں۔ میں ایک ایسی موت مر رہا ہوں جو میری اپنی ہے۔ جو میرے مقرر کردہ وقت پر مجھ تک آئی اور ویسے ہی آئی جیسے میں چاہتا ہوں۔ کوئی بھی اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بطور انسان کسی بھی انسان کی ہتک ہے۔۸

اسی کا بدلہ لینے کے لیے وہ کلرک اپنی مرضی سے تنہائی میں صبح کے وقت نیند کی گولیاں کھا کر سو رہنے اور موت کو بالارادہ گلے لگانے میں اپنے وجود کا اثبات سمجھتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کی کچھ خریداریاں بھی کرتا ہے۔ لیکن اس کی ''مرضی'' کی ہوا اس طرح نکل جاتی ہے کہ بازار سے لوٹتے ہوئے سڑک پار کرنے میں تیز رفتار ویگن اس کو کچل دیتی ہے۔

''منتظر'' ایک دلچسپ اور خیال انگیز افسانہ ہے۔ اس میں تین کردار ہیں۔ شاعر، صحافی اور گورکن۔ مگر تینوں ایک ہی بنیادی خیال کو آگے بڑھاتے ہیں کہ زندگی کے حقائق کس قدر سفاک اور تلخ ہیں اور اس کے بھیدوں کو کوئی نہیں جانتا۔ ان تینوں کرداروں کی زندگی کی گاڑیاں جیسے رُکی ہوئی ہیں۔ صحافی کو ڈھنگ کی نوکری میسر نہیں آتی، شاعر گمنامی کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے اور گورکن کے پاس اپنے بچے کی فیس کے پیسے نہیں۔

اس کہانی کو پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ پُر ہجوم شہروں میں لاکھوں لوگوں کے درمیان فرد کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ تو کچھ بھی نہیں، سائنسی ایجادات سے بھرپور صنعتی معاشرے کی تیز رو میں غتربود ہوتی ہستی اسے احساس دلاتی ہے کہ اس کی وقعت کچھ بھی نہیں تو نتیجتاً فرد اپنی ذات سے کٹتا چلا جاتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی جدوجہد لا حاصل ہے اور اس کی آزادی محدود، تو ایسے میں بیگانگی کی کیفیت جنم لیتی ہے۔ بیگانگی کی یہی وجودی کیفیت اس افسانے کے کرداروں پر مکمل طور سے چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

''سایہ کہانی'' بھی ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو وہم کا شکار ہے۔ یہ دراصل انسانی نفسیاتی الجھنوں کی کہانی ہے۔ کہانی میں مکمل طور پر خوف کا عالم چھایا ہوا ہے۔ ''سایہ کہانی'' آسیب کے موضوع پر ہے۔ آسیب میں غالباً وہم کا بھی دخل ہوتا ہے۔ وہم کی وجہ سے یہی تصورات شدید ہو جاتے ہیں۔ اس کمرے میں جہاں آسیب کا وہم ہو۔ بھرے دھویں سے اگر موت واقع ہو جائے تو آسیبی وہم کو پالے ہوئے لوگ یہی سمجھیں گے کہ جان ''سایہ'' نے

لی۔اس افسانے میں اسی بات کو مرکز بنا کر پلاٹ سازی کی گئی ہے۔آسیبی وہم والوں کی ایک بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ وہ جو چہرے دیکھتے ہیں اور دیکھتے رہے ہیں۔ان پر ان کا اعتبار اٹھ جاتا ہے۔اس طرح بے چہرگی کی مثال بھی فراہم ہو جاتی ہے۔جس گھر کی یہ کہانی ہے اس گھر میں تقریباً سبھی لوگ ایک وہم کا شکار ہیں اور سایہ سے بچنے کے لیے رات رات بھر چراغ جلا کر کمروں میں رکھتے ہیں کیونکہ اس وحشت، تنہائی اور تاریکی سے بچنے کا ایک یہی راستہ انہیں نظر آتا ہے۔اس موضوع پر افسانہ لکھ کر عاصم بٹ نے ہمیں وہم کے خطروں سے فنکارانہ طور پر آگاہ کیا ہے۔اور بے چہرگی کے مشاہدے کی ٹھوس بنیاد فراہم کی ہے۔

عاصم بٹ کے افسانوں میں اپنے عہد کے وجودیاتی مسائل میں گرفتار اور پھر ان مسائل کے حل کے لیے جہد و عمل کرتے دکھائی دینے والے، اپنے ارد گرد چار سو پھیلے ہوئے آشوب میں گھرے ہوئے اور ڈراؤنے خوابوں سے جاگ اٹھنے والے، نفسیاتی دباؤ تلے سسکتے ہوئے اور ان سے نجات نہ ملنے کی صورت میں خودکشی کرتے ہوئے افراد ان کہانیوں کے بنیادی کردار بنتے ہیں۔وہ اپنے ناموں کا اعلان کبھی کبھار ہی کر پاتے ہیں۔وہ بے نام تو نہیں ہیں لیکن اجتماعی زندگی کے جبر کے مقابل یہ کردار انفرادی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کے باوجود اپنے آپ کو اور اپنے ناموں کو بامعنی کرداروں کی صورت میں ظاہر نہیں کر پاتے۔

یہ اجتماعیت کے بوجھ تلے دبے ہوئے کردار ہیں جو اپنی انفرادیت کو اجتماعیت سے منوانے میں ناکام رہتے ہیں۔فرد کی انفرادی سائیکی کو اجتماعی اور ہجومیاتی سائیکی نے بہت حد تک مریضانہ بنا ڈالا ہے۔ڈاکٹر نوازش علی کے بقول:

> مسخ شدہ، عدم تحفظ کا شکار اور خوف میں مبتلا افراد واہموں کی صورت میں زندگی کی منفی شکلوں کو دیکھتے ہیں اور پچکتے دبتے چلے جاتے ہیں۔مہملیت اور لغویت سے پُر زندگی کے نوحے پڑھتے ہوئے کردار عاصم بٹ کے افسانوں میں اپنے ناموں کے ساتھ وارد ہوتے ہیں اور بے نام ہو کر کہیں دھند میں غائب ہو جاتے ہیں۔وہ کم مایہ اور بے وقعت زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔۹

چنانچہ عاصم بٹ کے افسانوی کردار جبری انتخاب کے مرحلے سے گزرتے ہیں۔ان کے ہاں زندگی کی قبولیت کی بجائے زندگی سے اکتاہٹ کا رویّہ جنم لیتا ہے۔عاصم بٹ کے کردار ایک سطح پر وجودی نوعیت کے ہیں، ہر چند کہ ان کے تمام مسائل فلسفیانہ نہیں نفسیاتی نوعیت کے ہیں مگر بنیادی مسئلہ کسی معانی کی تلاش ہی ہے۔یہ نفسیات اس معاشرتی سماجی زندگی سے جنم لیتی ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں۔عاصم بٹ کے کردار گنجان علاقوں کے شور شرابے

میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر ان کے اندر کی آواز ہمیشہ شور شرابے پر غالب رہتی ہے وہ گزرتے دنوں کو شمار کرتے رہتے ہیں اور کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی فکر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ عاصم بٹ کی کہانیوں میں خواب ایک استعارہ ہے۔ یہ ایک ایسا استعارہ ہے جس نے افسانہ نگار کو خارج سے باطن اور حقیقت کو غیر حقیقت سے ملانے کی سہولت فراہم کی ہے۔ عاصم بٹ باطنی پیچیدگیوں، تاریکیوں، تنگیوں، لاشعوری گہرائیوں کے پورے نظام کو اپنی منظری اور مبہم عبارت کے ذریعے منعکس کرتے ہیں اور واقعات کی کڑیوں کو معنی خیز انداز میں ملاتے ہیں۔

عاصم بٹ کے ناول فکری اعتبار سے دلچسپ ہیں۔ ان میں کرداروں کے مکالمات، ان کی داخلی خود کلامی، ان کے خیالات، ان کی زندگی کے المیہ و حزنیہ دراصل ناول نگار کے فکری رجحانات کی غمازی کرتے ہیں۔ عاصم بٹ اپنے کرداروں کے ذریعے دورِ جدید کے انسان کا مسئلہ اٹھاتے ہیں۔ کئی چہروں کی زندگی بسر کرنے والے انسان کا داخلی کرب سمٹ کر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

عاصم بٹ کے ناول ''دائرہ'' کی موضوعاتی جدت قابلِ تحسین ہے۔ ''دائرہ'' کو وجودیت کے حوالے سے مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ دوہری زندگی کا عذاب اور شناخت کی گمشدگی بلاشبہ اس ناول کا بنیادی موضوع ہے جس کا تحیر اختتام تک قائم رہتا ہے۔ دوہری زندگی کا عذاب دائرے کی طرح لامختتم ہے۔ دائرے کا ہر کردار اپنے حصے کی گولائی میں اس طرح اضافہ کر جاتا ہے کہ اسے اپنی ابتدا کی خبر ہوتی ہے اور نہ انتہا کی۔ اس ناول کا موضوع ہر انسان کی زندگی کا موضوع ہے۔ اس کے کردار متوسط طبقے کے عام کردار ہیں جو معاشرے کے جبر میں پس رہے ہیں لیکن اپنی زندہ دلی سے جی رہے ہیں۔

اس ناول میں کہانی در کہانی چلتی ہے جو دراصل اس حقیقت کی عکاس ہے کہ ہر انسان دراصل دائرہ در دائرہ سفر میں ہے اور دائروں کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ناول نگار نے دو الگ کرداروں کے ذریعے جہاں دورِ جدید کے انسان کا مسئلہ اُٹھایا ہے۔ وہیں اُس نے زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو ایک نئے تناظر میں پیش کیا ہے۔ دائروں میں گزرتی اور سسکتی زندگی ہمارے سامنے رونما ہوتی ہے جس کی کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ یہ ایک ایسا تسلسل ہے جو دائرے کی طرح جاری و ساری ہے۔

محمد عاصم بٹ کے اس ناول میں اُن کے فکر کے منفرد اور انوکھے مظاہرے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ناول کے موضوع میں گہرائی ہے جو قارئین کے لیے غور و فکر کے در وا کرتی ہے۔ دورِ جدید میں انسان شناخت کے جس بحران سے دوچار ہے اُس کا عملی اظہار اس ناول میں نظر آتا ہے۔ بلاشبہ انسانی زندگی بھی ایک دائرے کی مانند ہے۔ آج کا

انسان اپنی شناخت کے بحران کا شکار ہے اور اس احساس نے اُس کی زندگی کے کرب کو شدید تر کر دیا ہے۔ایسے میں پورے انسان کا عکس ملنا محال ہے۔

عاصم کے ہاں زندگی اور فن کا شعوری امتزاج نظر آتا ہے۔ان کی فکشن میں حقیقت نگاری اور مقصدیت غالب نظر آتی ہے۔اپنے دونوں ناولوں میں اپنے نظریات اور افکار کو عملی جامہ پہنانے کی ایک کاوش کی ہے۔ناول ''دائرہ'' زندگی کا دائرہ ہے اور لا مختتم ہے اور ناول ''ناتمام'' کا مقصد بھی دراصل یہ امید ہے کہ شاید اس کہانی کے بعد اندھیرا ختم ہو جائے۔

ناول ''دائرہ''میں کرداروں کے مکالمات،اُن کی داخلی خود کلامی،اُن کے خیالات،اُن کی زندگی کے المیہ و حزنیہ زندگیوں کے واقعات اس طرح دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ تحریر کا ایک ایک لفظ قارئین کے لیے مفاہیم کے نئے در وا کرتا ہے۔خاص طور پر ناول کا سب سے اہم کردار ''راشد''اور ناول میں ہی اُس کا دوسرا رُخ ''آصف مراد'' کا کردار دونوں اس طرح مل جاتے ہیں کہ ان کی تفریق مشکل ہو جاتی ہے۔راشد اداکار ہے اور اپنے پیشے کے ساتھ اتنا مخلص ہے کہ ناول کی قرأت کے دوران بار بار قاری فلمی اور حقیقی زندگی کے منظر میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔روبینہ سلطان لکھتی ہیں:

> آصف مراد اصل میں اس فلم ''دائرہ'' کا ایک کردار ہے جس کا اصل نام راشد ہے۔یہ ناول کی ایک پرت ہے جس کو راوی قوتِ ترغیب سے لیس کر کے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے لیکن یہ قوت ترغیب یہیں ختم نہیں ہوتی اس کے بعد کہانی کی اگلی پرت شروع ہوتی ہے جہاں آصف مراد خود کو راشد ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور مسلسل یہ کہتا ہے کہ وہ آصف مراد ہے راشد نہیں ہے۔یہاں پر راوی ایک اور نکتہ بیان کرتا ہے جو بڑا اُلجھا ہوا ہے اور ساتھ ساتھ قاری کو بھی اُلجھاتا ہے یعنی اگر آصف مراد راشد ہے تو آصف مراد کون ہے اور اگر آصف مراد ہے تو راشد کون ہے۔پھر اسی شخصی پہچان کا المیہ پوری کہانی میں چلتا ہے۔۱۰

محمد عاصم بٹ نے اس ناول میں لاہور کی تہذیب،اندرون شہر کی تنگ و تاریک فضا،محبت کے دعوے داروں کی مکاریاں اور عیاریاں اور معصوم لڑکیوں کے بہکاوے میں آنے کے موضوعات کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔مصنف نے اس ناول میں متوسط طبقے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔دراصل یہ طبقہ ہماری طبقاتی تقسیم میں نہایت اہمیت کا حامل ہے اور دوہری زندگی کے عذاب کا شکار ہے۔محمد منصور عالم کے بقول:

دوہری زندگی کا عذاب دائرے کی طرح لامختتم ہے۔دائرے کا ہر کردار اپنے حصے کی گولائی میں اس طرح اضافہ کر جاتا ہے کہ اسے اپنی ابتدا کی خبر ہوتی ہے اور نہ انتہا کی۔اس ناول کا موضوع ہر انسان کی زندگی کا موضوع ہے۔۱۱

محمد عاصم بٹ کا دوسرا ناول ''ناتمام'' دراصل اس تمنا کا اظہار ہے کہ معاشرے سے برائیوں کا یہ سلسلہ تمام ہو جائے۔اس خواہش کا اظہار اُنھوں نے ناول کے آغاز میں کیا ہے:

> سورج ڈوب جاتا ہے تو روشنی اندھیرے کے پیٹ میں نطفہ بن کر بیٹھ جاتی ہے۔ایک نئے سورج کو جنم دینے کے لیے ایک نئے کل کی اُمید بن کر۔جو کہانی میں ہم آئندہ صفحوں میں پڑھنے جارہے ہیں۔اُس کی بنیاد میں شاید اُمید کا دخل نہ ہو، لیکن اسے یہاں پیش کرنے کی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یوں سنانے سے شاید یہ کہانی کہیں ختم ہو سکے۔۱۲

محمد عاصم بٹ کے ناول ''ناتمام'' میں کئی کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ایک کہانی کا مرکزی کردار صائمہ ہے اور دوسری کہانی یشودھرا اور سدھارتھ کی ہے۔یشودھرا تیرہ برسوں کے بعد ماں بنتی ہے لیکن سدھارتھ اُسے چھوڑ کر نروان حاصل کرنے کے لیے جنگلوں بیابانوں میں چلا جاتا ہے۔آٹھ برس بعد سدھارتھ کے واپس لوٹنے پر اُس ٹھکرائی ہوئی عورت کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

ایسی ہی ایک اور کہانی رامائن میں بیان کردہ سیتا اور رام کی ہے۔ سیتا کے کردار پر بھی تہمت لگی۔ایودھیا کے عوام کی خواہش پر اسے محل سے نکال دیا گیا۔ بارہ برس کے بعد جب رام کا اپنے بچوں سے سامنا ہوا تو اُس نے سیتا سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن سیتا کے آنے کے بعد رام سمیت کسی نے بھی اسے معاف نہیں کیا اور سیتا زندہ دھرتی میں سماگئی۔

> محمد عاصم بٹ نے حقیقت کے باطن میں چھپے ہوئے گہرے شعور سے کام لیا ہے۔دراصل عاصم بٹ کے ناول لاکرداریت کے عکاس ہیں۔موجودہ دور کا انسان اپنی شناخت کھو چکا ہے۔کرداروں کی شناخت کا مسئلہ ہمیں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔موجودہ عہد کا انسان جو حقیقی عقل و شعور سے تہی ہے وہ اپنے آپ کو باشعور اور باکردار سمجھتا ہے لیکن ابھی بھی اس کی جبلت سے حیوانیت منہا نہیں ہوئی۔زندگی کے باطن کا یہ کھوکھلا پن محمد عاصم بٹ کے ناولوں کا خاص موضوع ہے۔۱۳

''ناتمام'' میں عاصم بٹ نے بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ کہیں کہیں ہمیں شعور کی رو اور خود کلامی کی تکنیک کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ ''ناتمام'' دراصل ہمارے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ عاصم بٹ نے اس کہانی کے ذریعے حقیقت نگاری کی عکاسی کی ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عاصم بٹ اس عہد کے اہم ناول نگار ہیں۔ اُن کے افسانے اور ناول پاکستانی معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ عاصم بٹ ایک واضح نظریاتی سوچ رکھتے ہیں۔ انہوں نے جدید انسان کی باطنی اور خارجی کیفیات، نفسیات اور مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ چونکہ عاصم بٹ ۹۰ کی دہائی میں نمایاں ہونے والے فکشن نگاروں میں شامل ہیں اور ۹۰ کی دہائی سے اب تک کا عہد میں ہمیں خوف، دہشت، مایوسی، اکتاہٹ، گھن، کراہت، بے حسی اور بے خوابی جیسے موضوعات عام ملتے ہیں، اس لیے عاصم بٹ کے ہاں بھی ہمیں انہیں وجودی عناصر کی بھرمار دیکھنے کو ملتی ہے۔ عاصم بٹ کے فکشن میں ان وجودی اور کافکائی عناصر کے در آنے کی ایک وجہ فرانز کافکا کی کہانیوں کے تراجم کرنا بھی ہے۔ اُن کے گہرے مشاہدے، وسیع اور تیز نظر، انسانی فطرت کی نباضی، واقعیت نگاری اور سادہ بیانی ایسی خوبیاں ہیں۔ جن کی وجہ سے انھوں نے ناول نگاری میں اپنی انفرادیت پیدا کی ہے۔ انہی محاسن کی بنا پر جدید ناول نگاری میں اُن کی اہمیت مسلم رہے گی۔

حوالہ جات

۱۔ امجد طفیل، اشتہار آدمی اور دوسری کہانیاں، (غیر مطبوعہ، فوٹو کاپی محفوظ)، ص:۲

۲۔ محمد سلیم الرحمن، ریویو اشتہار آدمی اور دوسری کہانیاں، فرائیڈے ٹائمز، ۱۹۹۸ء

۳۔ محمد منشا یاد، دستک، محمد عاصم بٹ کی کہانیاں، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص۷

۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، اشتہار آدمی اور کہانیاں، مشمولہ: اوراق، مدیر وزیر آغا، لاہور، ص۲

۵۔ نوازش علی، ڈاکٹر، اشتہار آدمی اور دوسری کہانیاں: ایک جائزہ، (غیر مطبوعہ)، ۹ جون ۱۹۹۸ء، ص۱

۶۔ محمد عاصم بٹ، دستک، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص۱۱۷

۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ماہنامہ اوراق، لاہور، مدیر وزیر آغا، ص۱۰

۸۔ محمد عاصم بٹ، دستک، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص۱۳۴

۹۔ نوازش علی،ڈاکٹر،اشتہار آدمی اور دوسری کہانیاں:ایک جائزہ،(غیر مطبوعہ)،۹ جون ۱۹۹۸ء،ص۲

۱۰۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار ،دستاویز،لاہور،جون،۲۰۱۲ء،ص:۲۱۷

۱۱۔ محمد منصور عالم،دستک،خبر نامہ شب خون،نومبر،۲۰۰۹ءتامئی ۲۰۲۰ء،ص:۱۱

۱۲۔ محمد عاصم بٹ، ناتمام ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۴ء،ص:۳

۱۳۔ عاقب شہزاد،محمد عاصم بٹ کے فکشن میں وجودی عناصر،انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ،اسلام آباد،۲۰۱۸ء،ص۱۲۳